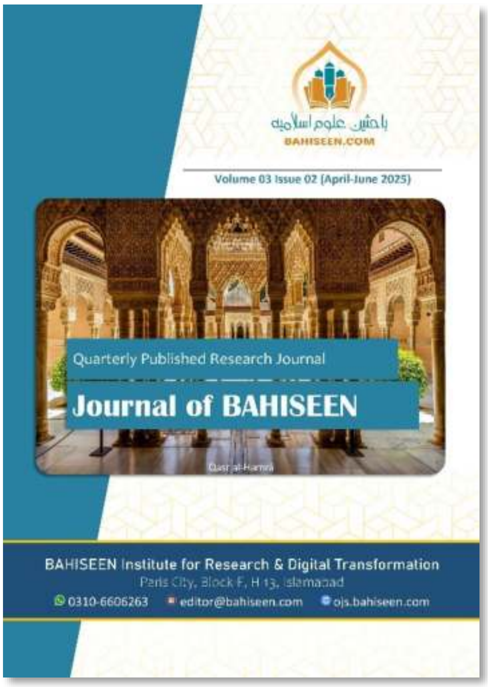

Title
Journal of BAHISEEN
Issue
Volume 03, Issue 02,
April -June 2025
ISSN
ISSN (Online): 2959-4758
ISSN (Print): 2959-474X
Frequency
Quarterly
Copyright ©
Year: 2025
Type: CC-BY-NC
Availability
Open Access
Website
ojs.bahiseen.com
Email
editor@bahiseen.com
Contact
+923106606263
Publisher
BAHISEEN Institute for
Research & Digital
Transformation, Islamabad

بین الاقوامی امن کے قیام میں سیرت النبی ﷺ اور مغربی دنیا کے نظریات کا تقابلی جائزہ

A Comparative Study of the Establishment of International Peace in the light of Seerah and Western Thought

Dr. Sabah Naz
Lecturer, DITC, NUML, Islamabad
Email: sabah.naz@numl.edu.pk
Dr. Irfan Saghir
Assistant Professor, Shifa Tameer Millat University, Islamabad
Email: hirfan125@gmail.com

Abstract

This study adopts a textual and documentary research methodology, primarily employing a descriptive-analytical approach to explore mechanisms and methods of peaceful conflict resolution found in both Islamic sources and international law. The objective is to trace, analyze, and compare the frameworks offered by Islamic teachings and modern legal instruments for resolving disputes peacefully. The research is specifically limited to selected provisions of the United Nations Charter—namely, Article 2 (clauses 1, 2, 3, and 4), Article 33 (clause 1), and Article 43 (clauses 1, 2, and 3). Judicial mechanisms are deliberately excluded from this study, allowing for a focused comparison between international legal norms and the teachings of the Prophet Muhammad (PBUH) as demonstrated in his Seerah.

The article seeks to contribute to the discourse on international peace by conducting a comparative analysis between the Prophetic model and Western political thought. It aims to answer critical questions such as: How can the teachings of the Prophet Muhammad (PBUH) be applied to modern international relations? What are the key similarities and differences between the Prophetic approach to peace and the principles found in Western political traditions? In what ways can both perspectives help address the global challenges of conflict, diplomacy, and justice?

By examining the key principles of peacebuilding in the Seerah—emphasizing justice, reconciliation, and diplomacy—and evaluating the dominant strategies of conflict resolution in Western thought, the study aims to provide a nuanced understanding of both traditions. Furthermore, it explores the relevance and applicability of these principles in addressing contemporary international crises. Through this integrated analysis, the research aspires to present a framework in which Islamic and Western perspectives may collaboratively contribute to the pursuit of lasting global peace in an increasingly interconnected and conflict-prone world.

Keywords: International Peace , Conflict Resolution , Justice and Reconciliation, Prophet Muhammad's Approach to Peace , Islamic Conflict Management, Western Thought

تمہید:

بین الاقوامی امن فطری طور پر تنازعات کے حل سے جڑا ہوا ہے، کیونکہ حل نہ ہونے والے تنازعات اقوام کے درمیان عدم استحکام اور تشدد کی بنیادی وجہ ہیں۔ پائیدار امن اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب تنازعات کو موثر طریقہ کار کے ذریعے حل کیا جائے جو انصاف، مفاہمت اور طویل مدتی تعاون کو یقینی بنائے۔ یہ تحقیق بنیادی طور پر تنازعات کے حل پر توجہ مرکوز رکھے گی، کیونکہ امن محض ایک نظریاتی تصور نہیں بلکہ ایک عملی حقیقت ہے، جو مؤثر تنازعات کے حل کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ کار سے، ہم مغربی نقطہ نظر کا تنقیدی طور پر موازنہ کر سکتے ہیں جو کہ زیادہ تر سفارتی مذاکرات، معاہدوں اور قانونی فریم ورک کے ذریعے تشکیل پاتے ہیں۔

اس کے ساتھ اسلامی نقطہ نظر، خاص طور پر رسالت مآب ﷺ کی جانب سے اختیار کیے گے طریقوں کا جائزہ لیں گے، جیسے کہ معاہدات (مثلاً حدیبیہ کا معاہدہ)، ثالثی، مصالحت، اور سماجی انصاف، نے نہ صرف فوری تنازعات کو حل کیا بلکہ مستحکم، پر امن معاشروں کی بنیاد بھی رکھی۔

اپنی تحقیق کو جدید بین الاقوامی تناظر کے ساتھ مربوط کرنے کے لیے، تنازعات کے حل سے متعلق اقوام متحدہ کے چارٹر کی دفعات کا جائزہ لیا جائے گا، خاص طور پر وہ اصول جو مذاکرات، ثالثی، اور بین الاقوامی قانون کے ذریعے تنازعات کے پر امن حل پر زور دیتے ہیں۔ ان اصولوں کا سیرۃ النبی ﷺ میں تنازعات کے حل کی حکمت عملیوں سے موازنہ کرتے ہوئے، دونوں نقطہ ہائے نظر کے فوائد اور ممکنہ خامیوں کی وضاحت کی جائے گی۔ یہ تقابلی تجزیہ نہ صرف آج کی دنیا میں پیغمبرانہ حکمت عملیوں کی مطابقت کو ظاہر کرے گا بلکہ امن کو برقرار رکھنے کے لیے موجودہ عالمی میکانزم کا تنقیدی جائزہ بھی فراہم کرے گا۔

تنازعات کے حل کا علمی و تاریخی پس منظر

ریاستوں کے درمیان تنازعات کے حل کا مسئلہ بین الاقوامی تعلقات میں ہمیشہ سے ایک اہم ترین چیلنج رہا ہے اور اب بھی ہے۔ تنازعات کے حل اور امن کا حصول ایک قدیم مسئلہ ہے۔ تاہم، تعلیمی حلقوں میں باقاعدہ ایک علمی مکالمہ اور ریسرچ کے طور پر اس مسئلہ پر 1950ء سے پہلے غور و فکر نہیں کیا گیا۔ مرورِ ایام کے ساتھ، اس شعبے نے مختلف حوالوں سے تیزی سے ترقی کی ہے۔ اس شعبہ میں ڈگریاں پیش کرنے والے متعدد یونیورسٹی پروگرام قائم کیے گئے ہیں، ساتھ ہی اس موضوع کے لیے مخصوص تحقیقی مراکز، تنظیمیں اور جرائد بھی سامنے آئے جن کا مقصد ایسے تنازعات کا حل پیش کرنا تھا۔(1)

سرد جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی نسلی تنازعات میں اچانک اضافے کی وجہ سے جو کہ علیحدگی یا اتحاد کی خواہشات سے کارفرما ہے، تنازعات کے حل میں ایک نئی جہت سامنے آئی، جس نے قیام امن میں مذہب کے کردار پر توجہ مرکوز کی۔ یہ میدان بتدریج علمی مباحث کے حاشیے سے مرکزی دھارے میں داخل ہوا۔ تاہم، جیسا کہ اسکاٹ ایپل بائی (Scott Appleby)(2) نے بیان کیا ہے، یہ ابھی تک مکمل طور پر پختہ نہیں ہوا ہے۔ یہ ابھی بھی اپنے "نوجوانی" کے مرحلے میں ہے، جس میں ابھی بہت کچھ ایسا ہے جس کو مزید منظم اور بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس موضوع پر اسلام کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا گیا۔ خاص طور پر 9/11 کی تباہی کے بعد، بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے جس نے مسلمانوں کو دو محاذوں کے ساتھ نبرد آزما کر دیا: انتہا پسندانہ حملوں کے خلاف اپنے دفاع کے لیے اندرونی جدوجہد اور اسلام کے خلاف دوسروں کے غصے اور دشمنی کے خلاف ایک بیرونی جدوجہد، جہاں انہوں نے اسلام پر ہونے والے اعتراضات کے تسلی بخش جواب دینے تھے۔ یہ جنگ آج بھی جاری ہے، کیونکہ مغرب میں اسلاموفوبیا کے رجحان، مشرق میں تنازعات کی شدت اور مغربی اور اسلامی تہذیبوں کے درمیان مبینہ تصادم آج بھی بحث و مباحثہ کا اہم موضوع ہے۔ یہ تمام حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ریاستوں کے مابین ہونے والے تنازعات کا پر امن حل پیش کرنے کے لیے اسلامی اور مغربی تعلیمات کا تقابلی جائزہ پیش کیا جائے۔

مفروضہ و سوالات تحقیق:

پر امن طریقوں سے تنازعات کے حل کے لیے اسلامی فقہ میں کیا اصول وضوابط ہیں؟ آپ ﷺ کے دور میں ان کے عملی اطلاق کیا تھے؟ اس سلسلے میں اسلامی ماڈل کا مغربی ماڈل سے کیا موازنہ ہے؟ مزید بر آں، اسلامی تعلیمات میں مفاہمت اور ثالثی کی کیا اہمیت ہے، اور کیا ان اصولوں کو عصری عالمی اور مقامی تنازعات پر مؤثر طریقے سے لاگو کیا جا سکتا ہے؟ مزید یہ کہ اسلامی ماڈل کس حد تک انسانی حقوق اور بین الاقوامی قوانین سے ہم آہنگ ہیں اور جدید دور میں اس کو عملی طور پر کیسے نافذ کیا جا سکتا ہے؟

مطالعہ کا طریقہ کار اور حدود

مطالعہ تحریری اور دستاویزی تحقیق کے طریقہ کار پر عمل پیرا ہے۔ تحقیقی مسئلے کو بنیادی طور پر وضاحتی تجزیاتی طریقہ استعمال کرتے ہوئے حل کیا گیا ہے، جس کا مقصد اسلامی ذرائع اور بین الاقوامی قانون دونوں میں پر امن تنازعات کے حل کے طریقہ کار اور طریقوں کا سراغ لگانا اور ان کا تجزیہ کرنا ہے۔ مزید بر آں، مطالعہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 2(شق:4،3،2،1) آرٹیکل 33(شق:1) اور آرٹیکل 43(شق 1،2،3) تک محدود ہے، عدالتی ذرائع کو زیر بحث لائے بغیر، ان کا موازنہ سیرت نبوی ﷺ کی تعلیمات سے کیا گیا ہے۔

سابقہ تحقیقات کا جائزہ:

اس میدان میں مطالعے کی تعداد نسبتاً محدود ہے۔ سب سے زیادہ قابل ذکر یہ ہیں:

ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی تحقیق: ان کی کتاب "العلاقات الدولیہ فی الاسلام (مقارنۃ القانون الدولی الحدیث)" جس کا اردو ترجمہ "بین الاقوامی تعلقات: اسلامی اور بین الاقوامی قانون کا تقابلی مطالعہ" کے نام سے شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد، نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اسلامی فقہی نقطہ نظر سے بین الاقوامی تعلقات کے اصولوں پر بحث کرتی ہے، جنگ اور امن، معاہدوں اور سفارتی تعلقات سے متعلق قانونی احکام پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے دار الاسلام اور دار الحرب کی کلاسیکی تقسیم پر خاص زور دیتی ہے۔ تاہم، ہماری تحقیق کا مرکز بین الاقوامی امن کے قیام میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی حکمت عملیوں پر ہے، جس میں مغربی نظریات کا تقابلی تجزیہ شامل ہے۔ فقہی احکام پر انحصار کرنے کے بجائے، یہ مطالعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفارتی طرز عمل، معاہدوں، تنازعات کے حل کی حکمت عملیوں اور بین الاقوامی تعلقات میں پالیسیوں کا جائزہ لے کر ان کا معاصر عالمی امن کے نظریات سے موازنہ کرتا ہے۔

محمد الطباطبائی کی تحقیق:(3) جس کے دوسرے باب میں اسلامی فقہ کے مطابق پر امن طریقوں سے اسلامی ریاستوں کے درمیان تنازعات کے حل پر بحث کی گئی ہے۔ اور اگلے باب میں بین الاقوامی قانون کے مطابق اسلامی ریاستوں کے درمیان پر امن طریقوں سے تنازعات کے حل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم، اس مطالعے کی توجہ صرف اسلامی ریاستوں کے درمیان تنازعات کے پر امن طریقے سے حل کرنے پر ہے۔

محمد جبریل کی تحقیق:(4) اس کا تیسرے باب میں اسلامی قانون اور جدید قانونی نظام دونوں میں تنازعات کے حل کے طریقوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مطالعہ بنیادی طور پر بین الاقوامی تنازعات کے حل کے طریقہ کار پر توجہ مرکوز کرتا ہے جہاں مثبت قانون (Positive Law) کے مطابق تنازعات کے حل کے میکانزم کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ محمد ابو النمر (5) کی تحقیق ہے، جس کے پہلے حصے میں، اسلامی ذرائع سے شواہد پیش کرتے ہوئے، تنازعات کے حل میں عدم تشدد کی حکمت عملیوں اور قیام امن کی حمایت پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد باقی کتاب میں سیاسی، سماجی، ثقافتی اور پیشہ ورانہ شعبوں سے اخذ کردہ تین مقدمات کا خاص طور پر مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

پہلا مطالعہ: پہلی فلسطینی عوامی تحریک کو غیر متشدد سیاسی تحریک کے طور پر پیش کرتا ہے، جہاں اسلامی مذہبی اقدار نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ دوسرا مطالعہ: "صلحہ" (Sulha) کی روایت پر مبنی ہے، جو قبائلی عمائدین کے ذریعے خاندانی تنازعات کو پرامن طریقے سے حل کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ تیسرا مطالعہ ان رکاوٹوں کا جائزہ لیتا ہے جن کا سامنا اسلامی دنیا میں تنازعات کے حل کے تربیت کاروں (Conflict Resolution Trainers) کو کرنا پڑتا ہے۔

سابقہ تحقیقات میں اسلامی فقہ اور بین الاقوامی قانون کے فریم ورک کے اندر تنازعات کے پرامن حل پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ تاہم، یہ مطالعات یا تو اسلامی ممالک کے درمیان تنازعات تک محدود ہیں (جیسا کہ محمد الطباطبائی کی تحقیق) یا یہ تحقیقات بین الاقوامی قانون پر زیادہ توجہ رکھتے ہوئے مختصراً، اس کا اسلامی تعلیمات سے موازنہ پیش کرتی ہیں (جیسا کہ محمد جبریل کی تحقیق)۔ اسی طرح، محمد ابو نمر کا مطالعہ، اگرچہ اسلامی تعلیمات میں عدم تشدد اور امن کے اصولوں کو اجاگر کرتا ہے، لیکن زیادہ تر سیاسی اور سماجی و ثقافتی سیاق و سباق تک محدود رہتا ہے اور سیرت نبوی ﷺ میں پائے جانے والے تنازعات کے حل کے عملی نمونوں کا جامع تجزیہ نہیں کرتا۔

ہماری تحقیق سیرت النبی ﷺ اور بین الاقوامی قانون کے درمیان تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے عملی طریقہ کار کا جائزہ پیش کرتی ہے۔ مزید برآں، اس تحقیق میں سیرت سے اخذ کردہ اصولوں کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ کے چارٹر کی مخصوص دفعات کا تجزیہ کیا گیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بین الاقوامی تنازعات کے پرامن حل کے لیے کس طرح ایک جامع اور موثر فریم ورک فراہم کرتا ہے۔ یہ مطالعہ نہ صرف نظریاتی بصیرت پیش کرتا ہے بلکہ عصری سفارتی اور قانونی فریم ورک کے لیے ایک عملی متبادل تناظر بھی پیش کرتا ہے۔

امن و امان کا مفہوم:

امن اور سلامتی کا تصور انسانی معاشروں کی فلاح و بہبود، استحکام اور انصاف سے گہرا تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ مسلم اور مغربی مفکرین دونوں نے تشریح کی ہے۔ اسلامی فکر میں، امام غزالی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ امن انصاف کے نفاذ اور اخلاقی اقدار کی پاسداری سے قائم ہوتا ہے، کیونکہ انصاف کے بغیر، امن محض ایک عارضی تصفیہ رہ جاتا ہے۔(6) اسی طرح ابن خلدون نے اپنے "مقدمہ" میں امن کو سماجی استحکام اور حکومتی نظم سے جوڑا ہے۔(7)

دوسری طرف، مغربی مفکرین کے درمیان، تھامس ہوبس امن کو "سماجی معاہدہ" کے نتیجے میں دیکھتے ہیں، جہاں افراد اجتماعی سلامتی کے بدلے میں کچھ آزادیاں ریاست کے حوالے کر دیتے ہیں۔(8) جان لاک نے ایک مختلف نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے کہا کہ امن قدرتی حقوق کے تحفظ اور قانون کی حکمرانی سے جڑا ہوا ہے،(9) جب کہ کانٹ کا "دائمی امن" کا تصور ایک ایسے بین الاقوامی نظام کا تصور پیش کرتا ہے جہاں ریاستیں تنازعات کے بجائے مکالمے کو فروغ دیں۔(10)

اسلامی اور مغربی نقطہ نظر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلامی فکر روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر امن قائم کرتی ہے، جب کہ مغربی نظریات معاہدوں، قوانین اور سماجی نظم پر زور دیتے ہیں۔

تنازعات کے حل کا مفہوم:

اصطلاح "تنازعات کا حل "(Conflict Resolution) ایک جدید اصطلاح ہے جس نے ابھی تک عالمی سطح پر متفقہ تعریف حاصل نہیں کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ شعبہ، جو ہم آہنگی اور اتفاق رائے کے لیے کوشش کر کے اپنے وجود کا جواز پیش کرتا ہے، اب بھی اہم اختلافات کا شکار ہے، جس میں نہ صرف یہ کہ تجزیاتی ڈھانچہ بلکہ ان اصطلاحات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے جو اس موضوع کو بیان کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

تاہم ذیل میں چند اہم تعریفات کے ذریعے اس اصطلاح کا مفہوم جاننے کی کوشش کی جاتی ہے:

جان برٹن، بین الاقوامی تعلقات اور تنازعات کے مطالعہ میں ایک ممتاز اسکالر مانے جاتے ہیں۔ یہ تنازعات کے حل کا مفہوم بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> “Conflict resolution means eliminating the sources of conflict by addressing underlying human needs, rather than simply managing disputes through power or coercion”(11)

یعنی تنازعات کے حل کا مقصد بنیادی انسانی ضروریات کو سمجھنا اور مناسب حل تلاش کرنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ صرف ظاہری مسائل کو حل کر لیا جائے اور بس، بلکہ تنازعات پیدا ہونے کے اسباب کو بھی سمجھا جائے۔ مزید یہ کہ صرف جبر یا طاقت سے ہی پائیدار حل حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ اصل توجہ اور مطمح نظر انسانی فلاح و بہبود ہونی چاہیے۔

ایک اور رائے یہ ہے کہ:

> “Conflict resolution is a process of finding a mutually beneficial agreement through principled negotiation rather than positional bargaining.”(12)

یعنی تنازعات کے حل میں دونوں فریقین کے مفادات کو مد نظر رکھنا چاہیے، جانب داری یا کسی ایک فریق کی حالت مضبوط ہونے کی وجہ سے صرف اسی کو فائدہ پہنچانا درست نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ تنازعات کا حل ایک ایسا عمل ہے جو کسی دیے گئے تنازعہ کے مرکز میں بنیادی شکایات کو دور کر کے مفاہمت کو فروغ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا مقصد صرف دشمنی ختم کرنے پر مرکوز نہیں ہے بلکہ مسئلے کی بنیادی وجوہات کو اس طرح حل کرنا ہے جو اس میں شامل تمام فریقین کے لیے نسبتاً قابل قبول ہو۔

تنازعات کے حل کی فکری بنیادیں: مغربی اور اسلامی فکر کا تقابلی مطالعہ

تنازعات کے حل کے نظریات اور طریقے کسی بھی تہذیب کی بنیادی فکری اور نظریاتی بنیادوں میں پیوست ہوتے ہیں۔ مغربی اور اسلامی نقطہ نظر کے درمیان بنیادی فرق ان کی فلسفیانہ، سماجی اور اخلاقی بنیادوں میں مضمر ہے، جو ان کے تاریخی پس منظر اور فکری ارتقا سے تشکیل پاتے ہیں۔

مغربی تناظر: سیکولر، طاقت پر مبنی، اور معاہداتی بنیادیں۔

مغرب میں تنازعات کے حل کی فکری بنیادیں، بنیادی طور پر سیکولر، معاہدات اور طاقت کے توازن پر مبنی ہیں۔ مغربی فلسفہ میں تین بڑے نظریات دیکھنے کو ملتے ہیں:

(i)طاقت کا توازن

تنازعات کے حل کے لیے مغربی نقطہ نظر کی روایتی ابتداء تھوسی ڈائیڈز (Thucydides) جیسے مفکرین سے ہوئی ہے، جو تنازعات کو حل کرنے اور امن کے قیام میں طاقت کو بنیادی عنصر سمجھتے تھے۔[13]

تھامس ہوبز نے اپنی کتاب Leviathan میں ریاست کو واحد اتھارٹی قرار دیا جو جنگ کو ختم کرنے اور امن کو یقینی بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ انسان فطری طور پر خود غرض اور جنگ کو پسند کرتا ہے۔[14]

(ii)سماجی معاہدہ

جان لاک[15] اور روسو[16] کے مطابق، تنازعات کے حل کا تعلق قوانین، معاہدوں اور جمہوری عمل سے ہے، جس میں فرد اور ریاست کے درمیان ایک معاہدہ موجود ہوتا ہے۔

کانٹ[17] نے اپنے نظریہ (Perpetual Peace) میں تنازعات کے حل کے لیے عالمی فریم ورک اور قانونی نظام کی ضرورت پر زور دیا۔

(iii)لبرل امن

جدید مغربی نظریہ لبرل ازم پر مبنی ہے، جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ جمہوریت، انسانی حقوق اور بین الاقوامی ادارے تنازعات کو حل کرسکتے ہیں۔

اقوام متحدہ، بین الاقوامی قانون، اور سفارتی مکالمے اسی سوچ کی عکاسی کرتے ہیں، حالانکہ یہ نظریہ بعض اوقات مغربی استعماری مفادات کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ (Paul E. Salem) پال سالم لکھتے ہیں کہ:

> “The 'focus of Western conflict resolution theorists on the suffering generated by conflict rather than on the justice or morality of the cause may not strike resonant philosophical cords in other cultures'... The conclusion to be drawn from this is not that the Arab world, for example, is more conflict-prone or less conflict resolution-oriented than the West but that in transporting western conflict resolution theories and techniques to the Arab world or elsewhere, they must undergo considerable cultural adaptation”[18]

یہ اقتباس مغربی تنازعات کے حل کے نظریات کی ایک بڑی کمزوری کو واضح کرتا ہے: وہ انصاف یا اخلاقی اصولوں پر کم اور صرف تنازع کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تکالیف پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ، یہ اقتباس یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ مغربی نظریات کو دیگر ثقافتوں میں بغیر کسی تبدیلی کے لاگو نہیں کیا جاسکتا، جو اسلامی اور مغربی نظریات کے درمیان ایک بڑا فرق نمایاں کرتا ہے۔

اس طرح، مغربی ماڈل کے مطابق، امن ایک غیر متوازن تصور ہے، جس کی جڑیں ویسٹ فیلین[19] نظام کی میراث میں پیوست ہیں، جو ریاست اور اس کی مکمل خود مختاری کو ترجیح دیتا ہے۔

مزید برآں، اقوام متحدہ کا کمزور ڈھانچہ اور بین الاقوامی نظام میں غالب طاقتوں کے لیے سیاسی طور پر قابل قبول ڈھانچے کو مستحکم کرنے کی ضرورت اس تصور کو مزید تقویت دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تنازعات کے حل کے طریقوں میں نرمی اختیار کی گئی، امن کے قیام کو ترجیح دی گئی تاہم انصاف کے معیار کو زیادہ اہم نہیں سمجھا گیا۔ نتیجتاً، یہ نظام بہت سے مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے جنہیں جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا تھا، خصوصاً وہ تنازعات جو شناخت، نمائندگی، علاقہ، انسانی سلامتی، اور معاشروں کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی تنظیم نو سے متعلق ہیں۔[20]

اسلامی تناظر: انصاف، ہمدردی اور شریعت پر مبنی حل

اسلامی تعلیمات میں تنازعات کے حل کی بنیاد عدل و انصاف، رحمت اور صلح پر ہے، جو قرآن و حدیث اور سیرت نبوی میں واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں۔

(i) عدل و انصاف کا بنیادی اصول

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَأۡمُرُ بِٱلۡعَدۡلِ وَٱلۡإِحۡسَٰنِ وَإِيتَآيِٕ ذِي ٱلۡقُرۡبَىٰ﴾[21]

"بے شک اللہ عدل، حسن سلوک اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے"

اس آیت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں تبصرہ کیا ہے کہ: "نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کے لحاظ سے یہ آیت نہایت جامع ہے۔"[22] یعنی یہ آیت اسلام کے فلسفہ اور اس کے احکام کو سمیٹتی ہے، کیونکہ اس میں ہر اچھی چیز کی پیروی کی ذمہ داری اور برائی سے بچنے کا فرض دونوں شامل ہیں۔

مزید برآں، آیت میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ شریعت صرف ایک حالت میں عدل کو لاگو نہ کرنے کی اجازت دیتی ہے جب اس کے بجائے فضیلت (احسان) پر عمل کیا جا رہا ہو۔ اس لیے کہ احسان، جیسا کہ امام راغب الاصفہانی نے اشارہ کیا ہے، عدل پر مقدم ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ: "انصاف کا مطلب ہے جو حق ہے وہ دینا اور جو حق ہے وہ لینا، جبکہ احسان کا مطلب ہے حق سے زیادہ دینا اور جو حق ہے اس سے کم لینا۔"[23]

اسی تناظر میں اسلام، داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر امن، استحکام اور سلامتی کے قیام کے لیے انصاف کو بنیادی شرط سمجھتا ہے۔

اندرونی سطح پر عدل و انصاف پر مبنی حکمران کی طرز حکمرانی عوام کو متحد کرتی ہے اور ان کے تحفظ کو یقینی بناتی ہے، جب کہ جبر اور ناانصافی بدامنی اور عدم استحکام کا باعث بنتی ہے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ حمص کے گورنر نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر شہر کے گرد ایک دفاعی دیوار بنانے کی اجازت طلب کی۔ اس کے جواب میں خلیفہ نے جواب دیا: "اسے انصاف کے ساتھ مضبوط کرو اور اس کی گلیوں کو ظلم سے پاک کرو۔"[24]

انصاف پائیدار امن کی کنجی ہے، کیونکہ امن اور انصاف لازم و ملزوم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مومنوں کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی جذبات کو اپنے فیصلوں پر اثرانداز نہ ہونے دیں اور انہیں انصاف کی راہ سے دور نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُونُواْ قَوَّٰمِينَ لِلَّهِ شُهَدَآءَ بِٱلۡقِسۡطِۖ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَـَٔانُ قَوۡمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعۡدِلُواْۚ ٱعۡدِلُواْ هُوَ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوَىٰۖ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرُۢ بِمَا تَعۡمَلُونَ٨﴾[25]

"اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے پر قائم رہو، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں عدل کرنے سے نہ روکے، عدل کرو، یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تمہارے کاموں سے باخبر ہے۔"

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ زمخشری بیان کرتے ہیں کہ: "مشرکوں سے تمہاری عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کو چھوڑ دو اور ان کے ساتھ ناانصافی کرو۔"[26]

پس اسلام کی خارجہ پالیسی میں طاقت کا استعمال جبر کے خلاف مزاحمت اور انصاف کے قیام کے لیے ہے، نہ کہ مضبوط فریق کے مفادات کو یقینی بنانے کے لیے۔ کیونکہ اسلام کے نقطہ نظر میں، طاقت بذات خود انصاف نہیں بنتی، بلکہ اس کا استعمال حق کی حمایت کے لیے کیا جاتا ہے۔

مغربی نسبیت پسندی بمقابلہ سیرت رسول ﷺ: تنازعات کے حل میں ایک بنیادی فرق

مغربی فلسفہ، خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد، نسبیت پسندی (Relativism) کی طرف مائل ہوا، جہاں انصاف اور حقوق کو مطلق قرار دینے کے بجائے حالات اور سیاق و سباق کے لحاظ سے متغیر قرار دیا جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق، مختلف گروہ یا افراد بیک وقت "صحیح" ہو سکتے ہیں، چاہے ان کے موقف ایک دوسرے سے متصادم ہوں۔ یہ اصول مغربی تنازعات کے حل میں جھلکتا ہے، جو اکثر معروضی انصاف پر سمجھوتہ (compromise) اور مفاہمت (conciliation) کو ترجیح دیتا ہے۔[27]

اس کے برعکس، سیرتِ نبوی ﷺ کی بنیادیں وحی الٰہی سے منسلک ہیں، جو اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ انصاف اور حقوق مطلق اور ابدی ہیں، یہ ہرگز ثقافتی یا فلسفیانہ تبدیلیوں کے تابع نہیں ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے کبھی بھی حق اور باطل کو برابر نہیں کیا اور نہ ہی صلح کی خاطر بنیادی انصاف پر سمجھوتہ کیا۔ مثال کے طور پر، فتح مکہ کے موقع پر، جہاں مغربی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے سیاسی طور پر مفید مفاہمت کی کوشش کی جا سکتی تھی، تاہم نبی کریم ﷺ نے انصاف کی فراہمی کو یقینی بنایا۔ جرائم کے مرتکب افراد کو جوابدہ ٹھہرایا گیا، جبکہ عام لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا گیا،[28] لیکن انصاف کے اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا گیا۔

اسلامی نقطہ نظر میں حق اور باطل کے درمیان فرق واضح اور غیر مبہم ہے۔ اگر ایک موقف حق پر ہو تو مخالف موقف کو درست نہیں سمجھا جا سکتا۔[29] اس کے برعکس، تنازعات کے حل کے لیے مغربی نقطہ نظر اکثر یہ فرض کرتا ہے کہ دونوں فریق کسی حد تک درست ہو سکتے ہیں، چاہے اس کے لیے بنیادی سچائیوں پر سمجھوتہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

یہ فرق صلح حدیبیہ کے معاہدہ میں واضح طور پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ ایک مفاہمتی معاہدہ تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے کسی بنیادی اصول پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ مثال کے طور پر جب قریش نے معاہدہ سے "رسول اللہ" کا لقب ختم کرنے کا مطالبہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے عارضی طور پر اس جملے کو ختم کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔[30] تاہم، اس نظر ثانی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ ﷺ نے اپنی نبوت پر شک کیا یا اسلام کے کسی بنیادی اصول کو چھوڑ دیا۔ یہ ایک حکمت عملی تھی، جس میں بنیادی اصولوں کو کسی بھی طرح سے پس پشت نہیں ڈالا گیا۔

لہٰذا اسلامی عالمی نظریہ میں، سچائی ایک یقینی اور غیر متغیر حقیقت ہے جسے وقتی مفاہمت یا سہولت کی خاطر تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس، مغربی طرزِ فکر میں حق کو سیاق و سباق کے مطابق لچکدار اور قابلِ ترمیم تصور کیا جاتا ہے۔

"تنازعات کے حل میں اسلام اور مغرب: مفاہمت یا اصولی عدل؟ تہذیبی تصادم کے اسلامی حل کا جائزہ"

مغربی فلسفہ عام طور پر اس مفروضے پر مبنی ہے کہ ہر تنازعہ کو مکمل طور پر حل کیا جا سکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے، چاہے اس کے لیے بنیادی اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کی ضرورت ہو۔[31] اس کے برعکس، اسلامی نقطہ نظر اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ بعض تنازعات فطری طور پر ناقابل مصالحت ہوتے ہیں، خاص طور پر جب یہ تنازعات حق اور باطل کے مابین ہوں۔ اسلام میں تنازعات کے حل کا مقصد محض مفاہمت نہیں بلکہ انصاف کا قیام ہے، اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ ظلم و زیادتی کا خاتمہ ہو۔[32]

فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے کسی بھی ناجائز سمجھوتہ کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ قریش میں سے جنہوں نے سخت ظلم کیا تھا ان کا احتساب کیا گیا جبکہ عام لوگوں کو عام معافی دی گئی۔ اگر تنازعات کے حل کے لیے مغربی نقطہ نظر کی پیروی کی جاتی تو شاید ایک "مصالحتی معاہدہ" کیا جاتا، جس سے ظالموں کو بھی رعایتیں دی جاتیں تاکہ یہ یقینی بنایا جا سکے کہ کوئی بھی فریق مکمل طور پر شکست خوردہ محسوس نہ کرے۔ تاہم، نبی کریم ﷺ نے انصاف پر مبنی اصولی موقف اختیار کیا، ظالموں اور مظلوموں کے درمیان واضح فرق کرتے ہوئے، اس بات کو یقینی بنایا کہ ناانصافی کے خاتمے کے ذریعے امن قائم ہو۔

یہ اصول اسلام کے "تدافع تہذیب" کے تصور سے مطابقت رکھتا ہے۔ مغربی نقطہ نظر کے برعکس، خاص طور پر سیموئیل ہنٹنگٹن کے "تہذیبوں کا تصادم" کا نظریہ۔(33) اسلام تہذیبوں کو مٹانے یا ان پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا ہے بلکہ اس کا مقصد ایک توازن برقرار رکھنا ہے جہاں ظلم کو روکا جائے اور انصاف کو برقرار رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَوۡلَا دَفۡعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعۡضَهُم بِبَعۡضٖ لَّفَسَدَتِ ٱلۡأَرۡضُ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ ذُو فَضۡلٍ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ ٢٥١﴾(34)

"اور اگر اللہ تعالیٰ ایک گروہ کو دوسرے کے ذریعے سے نہ روکتا تو زمین میں فساد ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ تمام جہانوں پر فضل کرنے والا ہے۔"

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ تنازعات کے حل کے لیے ظالم کو روکنے اور انصاف کی بحالی کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے، بجائے اس کے کہ جھوٹی صلح جو حق اور باطل کی تمیز کو دھندلا دے۔

صرف ناگزیر حالات میں طاقت کا استعمال

اسلام طاقت کے استعمال کو صرف آخری حربے کے طور پر قبول کرتا ہے،(35) جب کہ مغربی نقطہ نظر بعض اوقات جنگ کو امن قائم کرنے کے ایک ذریعہ کے طور پر دیکھتا ہے۔(36)

خلاصہ یہ کہ مغربی ماڈل کے مطابق امن ایک سیاسی تصور ہے، جہاں انصاف کو سب سے پہلے قربان کیا جاتا ہے، اس کے بعد سچائی کو مسخ کر کے اس کے حقیقی معنی کو چھین لیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی نقطہ نظر میں امن اور تنازعات کے حل کا نظریہ انصاف کی اقدار اور سچائی کے ایک طے شدہ تصور میں مضبوطی سے جڑا ہوا ہے۔ یہ نقطہ نظر اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ کچھ تنازعات حل نہیں ہو سکتے ہیں، خاص طور پر جب مخالفین اپنی ضد پر قائم رہتے ہیں اور اپنے ذاتی مفادات پر قائم رہتے ہیں، جو اکثر ناجائز عزائم کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

مغربی اور اسلامی ماڈلز کے درمیان پر امن طریقوں سے تنازعات کو حل کرنے کے ذرائع

بین الاقوامی تنازعات کے پر امن حل کے لیے کئی ذرائع دستیاب ہیں۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 33(1) کے مطابق، اگر تنازعہ کا تسلسل عالمی امن اور سلامتی کے لیے خطرہ بنتا ہے، تو اس میں شامل فریقوں کو پہلے اس کا حل مذاکرات، تحقیق، ثالثی، مصالحت، ثالثی، عدالتی فیصلے، علاقائی تنظیموں، یا اپنی پسند کے دیگر پر امن ذرائع سے تلاش کرنا چاہیے۔ یہ اصول آرٹیکل 2(3) کے ساتھ بھی مطابقت رکھتا ہے، جو یہ حکم دیتا ہے کہ اقوام متحدہ کے تمام اراکین کو بین الاقوامی امن، سلامتی اور انصاف کو لاحق خطرات کو روکنے کے لیے اپنے تنازعات کو پر امن طریقے سے حل کرنا چاہیے۔ مزید برآں، آرٹیکل 2(4) یہ بھی واضح کرتا ہے کہ کسی بھی ریاست کی علاقائی سالمیت یا سیاسی آزادی کے خلاف طاقت کا استعمال یا دھمکی دینا ممنوع ہے۔ اس کے علاوہ، آرٹیکل 43(1) امن کو برقرار رکھنے میں اجتماعی سلامتی کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے، جس میں اقوام متحدہ کے ارکان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ سلامتی کونسل کو جب ضروری ہو تو امن واستحکام کے نفاذ کے لیے فوجی مدد اور وسائل فراہم کریں۔ ان اصولوں کی بنیاد پر، اقوام متحدہ کا چارٹر تنازعات کے حل کے لیے تین بنیادی طریقوں کو تسلیم کرتا ہے۔ پہلا طریقہ متضاد فریقین کے درمیان براہ راست مذاکرات ہے، جس میں دونوں فریق باہمی بات چیت کے ذریعے کسی حل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے طریقہ میں ثالثی کی مختلف شکلیں شامل ہیں، جیسے کہ مفاہمت، خیر سگالی کی کوششیں، اور حقائق تلاش کرنے والے کمیشن، جو تنازعات کو حل کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ تیسرے طریقہ میں قانونی اور پابند اقدامات شامل ہیں، جیسے ثالثی اور عدالتی احکام، جو کسی تنازعہ کا باقاعدہ اور قانونی حل فراہم کرتے ہیں۔(37)

یہ تحقیق خاص طور پر سفارتی نقطہ نظر پر توجہ مرکوز کرے گی، خاص طور پر مذاکرات اور ثالثی کے طریقے۔ اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ یہ طریقہ کار اقوام متحدہ کے فریم ورک اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں پائے جانے والے اصولوں دونوں کے ساتھ کیسے مطابقت رکھتا ہے۔

1۔مذاکرات:

مذاکرات کو بین الاقوامی تنازعات کے حل کا بنیادی ذریعہ سمجھا جاتا ہے، کیونکہ یہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 33(1) میں مذکور پرامن اقدامات میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ تنازعات کے حل کے لیے عالمی سطح پر وسیع پیمانے پر قبول کیا جانے والا طریقہ ہے۔ مزید برآں، اقوام متحدہ کے چارٹر کا آرٹیکل 2 تمام رکن ممالک کو پابند کرتا ہے کہ وہ اپنے بین الاقوامی تنازعات کو پرامن طریقوں سے حل کریں اور عدم تشدد کے اصول کی پاسداری کرتے ہوئے، عالمی امن اور سلامتی کی بحالی کو یقینی بنائیں۔ اسی طرح آرٹیکل 43 اقوام متحدہ کے رکن ممالک کو سلامتی کونسل کے فیصلوں کے مطابق مذاکرات سمیت تنازعات کے پرامن حل کے لیے ضروری اقدامات کرنے کا پابند کرتا ہے۔

بین الاقوامی تنازعات کے پرامن حل پر منیلا اعلامیہ (15 نومبر 1982) مذاکرات کی دو اہم خصوصیات بیان کرتا ہے[38]: پہلی، ان کی لچک، کیونکہ ان کا اطلاق ہر قسم کے تنازعات (سیاسی، قانونی، یا تکنیکی) پر کیا جا سکتا ہے؛ اور دوسرا، ان کی تاثیر، کیونکہ دوسرے طریقوں کے برعکس، یہ صرف متنازعہ ریاستوں کے درمیان ہوتے ہیں، انہیں اس عمل پر مکمل کنٹرول دیتے ہیں اور انہیں اپنی سہولت کے مطابق مذاکرات کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔[39]

مزید برآں، اقوام متحدہ کا چارٹر اس اصول کو برقرار رکھتا ہے کہ تمام تنازعات کو ان طریقوں سے حل کیا جانا چاہیے جو عالمی استحکام اور بین الاقوامی تعلقات کی ترقی میں معاون ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تنازعات کے حل کے کسی بھی دوسرے طریقے کے مقابلے مذاکرات کو زیادہ کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے، جو ان کی تاثیر اور عملیت کا واضح ثبوت ہے۔

مذاکرات کی ایک بڑی خرابی اس وقت سامنے آتی ہے جب غیر مساوی فریقوں کے درمیان تنازعات کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ مضبوط فریق اکثر کمزور پر اپنی مرضی مسلط کرتا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر زرٹ مین کے مطابق، مؤثر مذاکرات کی تین بنیادی جہتیں ہوتی ہیں:

تشخیص: مسئلہ کو سمجھنا اور اس بات کی نشاندہی کرنا کہ فریقین کیا چاہتے ہیں۔

پیشکش: ایک فریم ورک تیار کرنا جو اس مسئلے کو منظم انداز سے بیان کر سکے۔

عملی نفاذ: وضع کردہ حل کو اس طریقے سے لاگو کرنا جس سے فریقین کے درمیان معاہدہ ہو جائے۔

زارٹ مین مزید وضاحت کرتے ہیں کہ مسئلہ حل کرنے کے فریم ورک کی تشکیل اکثر انصاف کے اصولوں پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ ان ناقابل تقسیم مفادات پر مبنی ہوتی ہے جنہیں دونوں فریق مضبوطی سے تھامے رکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ مذاکرات بنیادی طور پر دوسرے فریق کے تاثرات کو توڑنا ہے تاکہ باہمی طور پر قابل قبول نتیجہ پیدا کیا جا سکے، بشمول ان کی توقعات کو کم کرنے کے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے، مختلف دلائل استعمال کیے جا سکتے ہیں، جیسے کانگریس کی ذمہ داریاں، رائے عامہ، اور قانونی وعدے، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ مخالف کی زیادہ توقعات محض غیر حقیقی ہیں۔[40]

مذاکرات کا کردار تنازعات کے حل تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ انہیں مخصوص ممالک کے درمیان تعلقات کو فروغ دینے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی قانون اس کے لیے کوئی خاص لائحہ عمل نہیں بتاتا کہ بین الاقوامی مذاکرات کیسے ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اس طرح کے مذاکرات تحریری یا زبانی تبادلے، یا دونوں کے مجموعے کے ذریعے ہو سکتے ہیں۔ مذاکرات دو ممالک کے درمیان دوطرفہ بھی ہو سکتے ہیں، جس میں دو متعلقہ ریاستیں شامل ہوں، یا یہ مذاکرات کثیر الجہتی ہو سکتے ہیں، جہاں متعدد ممالک ایک ساتھ شریک ہوں۔[41]

اسلامی تعلیمات کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسلام نے اپنے ابتدائی ایام سے نہ صرف تنازعات کے حل کے لیے بلکہ تعلقات کو فروغ

دینے اور اسلامی پیغام کو پھیلانے کے لیے بھی مذاکرات کا استعمال کیا ہے۔(42) قرآن پاک مسلمانوں کو صلح کی طرف مائل ہونے کا حکم دیتا ہے(43) جب مخالف فریق ایسا کرنے پر آمادہ ہو، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسلامی تعلیمات میں مذاکرات کو ایک بنیادی اصول کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

اگرچہ اقوام متحدہ کا چارٹر مذاکرات کی لچک اور تاثیر پر روشنی ڈالتا ہے، تاہم عملی طور پر ان اصولوں کی بار بار خلاف ورزی کی گئی ہے۔ کمزور جماعتیں اکثر مذاکرات میں خود کو بے اختیار پاتی ہیں، جب کہ طاقتور ریاستیں اپنی مرضی مسلط کرتی ہیں۔ متعدد مواقع پر، اقوام متحدہ کے چارٹر میں درج انصاف اور مساوات کے اصولوں کو طاقتور ممالک کے مفادات کے حق میں نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس کی واضح مثال مسئلہ فلسطین ہے، جہاں کئی دہائیوں سے مذاکرات جاری ہیں، اس کے باوجود کمزور فریق کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا گیا۔ اس کے بجائے عالمی طاقتوں نے یکطرفہ فیصلے نافذ کیے ہیں۔(44)

اس کے برعکس اسلام نے ہر حال میں انصاف، مساوات اور کمزور جماعتوں کے حقوق کو برقرار رکھا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی انصاف اور اخلاقی اصولوں پر مبنی مذاکرات کی بے شمار عملی مثالیں فراہم کرتی ہے۔ مثال کے طور پر، حدیبیہ کے معاہدے کے دوران، شرائط شروع میں یکطرفہ معلوم ہوتی تھیں،(45) لیکن حقیقت میں ان کی بنیاد حکمت اور انصاف پر رکھی گئی تھی، جو بالآخر مسلمانوں کو فائدہ پہنچا رہی تھی۔ اسی طرح جنگ بدر کے بعد قیدیوں کے فدیہ کے حوالے سے مذاکرات وقار اور عدل کے ساتھ کیے گئے،(46) اس بات کو یقینی بنایا گیا کہ کمزور قیدیوں کے ساتھ طاقت کے ذریعے محکوم ہونے کے بجائے ان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔

یہ موازنہ واضح طور پر واضح کرتا ہے کہ اگرچہ اقوام متحدہ کے اصول نظریاتی طور پر درست ہیں، لیکن عملی طور پر ان کی اکثر خلاف ورزی ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے ان اصولوں کو تسلسل کے ساتھ نافذ کیا ہے، ہر مرحلے پر انصاف اور مساوات کو یقینی بنایا ہے۔

مذاکرات کے اصول و آداب:

مذاکرات کو اسلامی فقہ میں ایک طے شدہ اصول کے طور پر زیر بحث لایا گیا ہے۔ امام محمد بن الحسن الشیبانی نے اپنی کتاب "السیر الکبیر" میں اس موضوع پر ایک الگ باب ("بَابُ الْمُرَاوَضَةِ عَلَى الْأَمَانِ بِالْجُعْلِ وَغَيْرِهِ") کے نام سے مختص کیا ہے جس میں انہوں نے سیرت رسول ﷺ کے مختلف واقعات کے ذریعے مذاکرات کی شرائط اور اصول پر سیر حاصل بحث کی ہے۔(47)

امام الشیبانی نے مذاکرات سے متعلق ایک اہم سٹریٹیجک اصول بیان کیا ہے، جو جدید مفکر زرٹ مین کی فکر کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ مذاکرات کے دوران فریق مخالف کی توقعات کو کم کیا جائے، بایں صورت کہ پہلے ان ممکنہ رعایتوں کا اندازہ لگانا چاہیے جو دی جاسکتی ہیں اور پھر مذاکرات کے آغاز میں بڑے مطالبات پیش کیے جائیں، تاکہ بعد میں کچھ شرائط نکالنا آسان ہو، بجائے اس کے کہ بعد میں نئی شرائط شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اسی تناظر میں، معاہدے کا مسودہ تیار کرتے وقت، ابتدائی طور پر سخت ترین شرائط کو شامل کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ تاہم کوئی بھی معاہدہ جو اسلامی اصولوں اور اللہ کی مقرر کردہ حدود سے متصادم ہو، ناقابل قبول ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ حدیبیہ کے مذاکرات کے دوران فرمایا تھا کہ وہ ایسی کوئی تجویز قبول نہیں کریں گے جس سے اللہ کی حرمت کی خلاف ورزی ہو۔(48)

2۔ مصالحت اور ثالثی

بسا اوقات اعلیٰ سطح پر تنازعات، عدم اعتماد کا باعث بنتے ہیں، جس کے نتیجے میں فریقین کے درمیان براہ راست رابطے کے راستے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں فریقین یا تو کسی حل تک پہنچنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اور یا ان کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسی صورت

میں وہ کسی فریق ثالث کو تنازعہ کے حل کی ذمہ داری سونپ دیتے ہیں۔(49)

بنیادی طور پر ثالثی، ایک رضاکارانہ اور پر امن طریقہ ہے جس میں کوئی بیرونی ادارہ یا کوئی تیسرا فریق شامل ہوتا ہے جو تنازعہ کرنے والے فریقین کو ان کے تنازعہ کو حل کرنے میں مدد کرنے کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے۔

بین الاقوامی معاہدوں میں ثالثی کے اصول کو واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 33 کے علاوہ، بین الاقوامی تنازعات کے پر امن حل پر 1907 کا ہیگ کنونشن (آرٹیکلز 2-8) بھی ریاستوں کو بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لیے ثالثی کا سہارا لینے کی ترغیب دیتا ہے۔ اسی طرح، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی متعدد قراردادوں میں ثالثی کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے، جن میں 15 نومبر 1982 کا منیلا اعلامیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس اعلامیے میں کہا گیا ہے کہ، اگر ان کے مذاکرات کے تسلی بخش نتائج نہیں نکلے، تو انہیں اقوام متحدہ کے ثالث کی سہولت کے ذریعے حل تلاش کرنا چاہیے۔(50)

بعد ازاں، 2004 میں، اقوام متحدہ نے تنازعات کے حل کے لیے ثالثی پر بڑھتے ہوئے عالمی انحصار کو تسلیم کرتے ہوئے، "ثالثی سپورٹ یونٹ" قائم کیا۔(51)

مصالحت اور ثالثی سے متعلق اسلامی تعلیمات:

مندرجہ بالا بحث کی بنیاد پر یہ جان لیا گیا ہے کہ جدید دنیا میں ثالثی کو متضاد فریقوں کے درمیان تنازعات کو حل کرنے کے ایک ذریعہ کے طور پر جائز سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو ثالثی کے جواز کے مختلف دلائل دیکھنے کو ملتے ہیں جیسا کہ قرآن، مومن متحارب گروہوں کے درمیان صلح کرنے کا حکم دیتا ہے:

﴿وَإِن طَآئِفَتَانِ مِنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ٱقۡتَتَلُواْ فَأَصۡلِحُواْ بَيۡنَهُمَاۖ﴾(52)

"اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔"

اسی طرح ایک اور جگہ ثالثی کی اہمیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

﴿لَّا خَيۡرَ فِي كَثِيرٖ مِّن نَّجۡوَىٰهُمۡ إِلَّا مَنۡ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوۡ مَعۡرُوفٍ أَوۡ إِصۡلَٰحِۭ بَيۡنَ ٱلنَّاسِۚ﴾(53)

"ان کی زیادہ تر خفیہ گفتگو میں کوئی بھلائی نہیں سوائے ان لوگوں کے جو صدقہ کا حکم دیتے ہیں، یا صحیح بات کرتے ہیں، یا لوگوں کے درمیان صلح کرواتے ہیں،"

یہ آیات تنازعات کو خوش اسلوبی سے حل کرنے کے ایک جائز ذریعہ کے طور پر ثالثی کی اسلامی بنیاد کو واضح کرتی ہیں۔

سیرت نبوی ﷺ سے بھی ثالثی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ امام بخاریؒ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ بنو عمرو بن عوف کے لوگوں کے درمیان جھگڑا ہوا تو آپ ﷺ ذاتی طور پر صحابہ کرام کے ایک گروہ کے ساتھ تنازعہ کو حل کرنے کے لیے گئے۔(54)

آپ ﷺ نے صلح کی اجازت پر مزید زور دیتے ہوئے فرمایا:

"مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے، سوائے اس صلح کے جو حلال کو حرام کر دے یا حرام کو حلال کرے۔"(55)

مسلم معاشرے کے اندر مقامی ثالثی کے اس اصول کو جدید سیاق و سباق میں بین الاقوامی ثالثی تک بھی بڑھایا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ بین الاقوامی تنازعات کو حل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

اسی طرح غزوہ بدر کے قیدیوں سے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا:

"اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور مجھ سے ان قیدیوں کے بارے میں بات کرتے تو میں ان کو اس کی خاطر رہا کر دیتا۔"(56)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مطعم بن عدی جو کہ ایک غیر مسلم تھے، قیدیوں کی رہائی کے لیے ثالثی کرتے تو آپ ﷺ ان کی درخواست قبول کر لیتے۔ اگرچہ یہ ثالثی بظاہر عمل میں نہیں آئی کہ مطعم بن عدی کا انتقال ہو گیا تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کے الفاظ ثالثی کے اصول کو ایک قابل قبول عمل کے طور پر ثابت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہجرت کے پہلے سال جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حمزہ بن عبدالمطلب کو ساحل کے قریب قریش کے ایک قافلے کو روکنے کے لیے تیس مہاجرین پر مشتمل ایک مہم کے سربراہ کے طور پر بھیجا تھا۔ اس گروہ کی قیادت جو تین سو جنگجوؤں پر مشتمل تھا، ابو جہل کر رہا تھا۔ یہ گروہ لڑنے کے لیے تیار تھا۔ تاہم، قبیلہ جہینہ کے سردار، مجدی بن عمرو الجہنی جو دونوں گروہوں کے حلیف تھے، نے مصالحت کی کوشش کی اور سفارتی کوششوں کے ذریعے تصادم کو روک دیا۔(57)

اس کی سفارتی مداخلت نے خونریزی کو کامیابی سے روکا، تنازعات کے حل میں ثالثی کی تاثیر کا مظاہرہ کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست دوسری ریاست کی طرف سے ثالثی کی پیشکش کے جواب میں فوجی مصروفیت کو روکنے کا انتخاب کر سکتی ہے، بشرطیکہ اس کے نتیجے میں مسلم امہ کو نقصان نہ پہنچے۔

ثالثی کی ایک اور قابل ذکر مثال 7 ہجری (629 عیسوی) میں جنگ خیبر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور فدک کے لوگوں کے درمیان امن معاہدہ تھا۔ اس معاہدے میں محیصہ ابن مسعود (بنو حارثہ کے سردار) ثالثی بنے، جس نے دونوں فریقوں کے درمیان پر امن تصفیہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔(58)

اس کے علاوہ صلح حدیبیہ،(59) تنازعات کے حل میں مصالحت کو دی جانے والی ترجیح کو ظاہر کرتا ہے، بشرطیکہ یہ طویل مدتی امن اور سماجی ہم آہنگی کا باعث بنے۔ اور شریعت اسلامی مشاورت(60) جیسے اصولوں پر تنازعات کے حل کے لیے ضروری طریقہ کار کے طور پر بھی زور دیتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ثالثی کی کسی بھی شکل کو قانونی طور پر اس وقت تک جائز سمجھا جائے گا جب تک کہ یہ لوگوں کو نیکی کے قریب لائے اور انہیں برائی سے دور کرے، اور اسلامی تعلیمات سے متصادم نہ ہو۔ لہٰذا، ان معاملات میں ثالثی قابل قبول نہیں ہے جنہیں شریعت اسلامی غیر قانونی سمجھتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے چوری کی مقررہ سزا معاف کرانے کی کوشش کی تو آپ ﷺ نے اس سفارش کو رد کر دیا۔(61)

اس بحث کے آخر میں اس بات کا بیان بھی ضروری ہے کہ اسلامی اور مغربی ثالثی کے درمیان ایک اہم فرق یہ ہے کہ، اسلامی اصولوں میں، ثالث ضروری نہیں کہ کوئی بیرونی، غیر جانبدار فریق ہو۔ جیسا کہ جارج ایرانی بیان کرتے ہیں:

> "جب مغربی وساطت کاروں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پیشہ ور، باضابطہ، اور مکمل طور پر غیر جانبدار ہوں، اور کسی ایک فریق سے وابستہ نہ ہوں، تو اسلامی وساطت میں 'تیسرا فریق' عام طور پر اندرونی فرد ہوتا ہے۔ وہ غیر جانبدار تو ہوتا ہے، مگر فریقین سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ مزید برآں، اس کے اندر عوامی بھلائی کا شدید احساس، سماجی حیثیت، تجربہ، قیادت، اور معمر ہونے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو اسے قابلِ اعتماد بنا دیتی ہیں۔"(62)

تنازعات کے پر امن حل کے لیے اسلامی حکمت عملیوں کی صورتیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اختیار کی گئی پالیسی سفارتی مہارت اور تنازعات کے دانشمندانہ حل کی ایک بہترین مثال ہے۔

یہ صلاحیتیں ان کی زندگی کے ابتدائی سالوں میں بھی ظاہر ہوئیں، جب مکہ کے قائدین کے درمیان حجر اسود کی جگہ کے بارے میں تنازعہ پیدا ہوا

،تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دانشمندانہ حل تجویز کیا، جس کو سب نے تسلیم کیا، اور خون ریزی سے بچاؤ ممکن بنالیا گیا۔

ذیل میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے استعمال کردہ اہم مذاکرات اور ثالثی کی حکمت عملیوں کا خاکہ پیش کریں گے۔ اس مقصد کے لیے صلح حدیبیہ کو بطور مثال پیش کیا جائے گا، جس میں آپ ﷺ کی قائدانہ صلاحتیں اور مذاکرات کی غیر معمولی مہارت اجاگر ہوں گی۔ اس کے علاوہ میثاقِ مدینہ کو بھی ذکر کیا جائے، تاکہ آپ ﷺ کی مصالحتی اور ثالثی کی مہارتیں بھی واضح ہو سکیں۔

صلح حدیبیہ: نبی کریم ﷺ کی مذاکراتی حکمت عملی

6 ہجری (628 عیسوی) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش مکہ کے درمیان ایک اہم معاہدہ ہوا، جسے صلح حدیبیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ اس وقت ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے 1500 ساتھیوں کے ساتھ عمرہ کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ احرام باندھ کر اور میان شدہ تلواروں کے علاوہ کوئی ہتھیار نہ لے کر مسلمانوں نے صاف ظاہر کر دیا تھا کہ ان کی نیت عبادت ہے، جنگ نہیں۔ تاہم، قریش نے مکہ میں ان کا داخلہ بند کر دیا۔ اس کے رد عمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنازعہ کے بجائے مذاکرات اور سفارتی حکمت عملی کو اپنایا۔ مذاکرات کے کئی دور پیش آئے، اور بالآخر دس کے لیے جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔(63)

نبی کریم ﷺ کی مذاکراتی حکمت عملی

طاقت پر بھروسہ کرنے کے بجائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تنازعات سے بچنے کی حکمت عملی کا انتخاب کیا، جو کہ حالات کو دیکھتے ہوئے انتہائی دانشمندانہ فیصلہ تھا، چونکہ مسلمان تین محاذوں سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے:

شمال: خیبر اور وادی القریٰ کے یہودی قبائل

مشرق: نجد کے قبائل جن میں غطفان اور بنو اسد شامل ہیں۔

جنوب: مکہ میں قریش(64)

قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا قبیلہ تھا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم از کم غیر جانبدار رہنے کو ترجیح دی۔ آپ ﷺ نے بار بار اپنے پر امن ارادوں کا اظہار کچھ یوں کیا کہ:

((والله لا تدعوني قريش اليوم إلى خطة يسالوني فيها صلة الرحم إلا اعطيتهم إياها(---)"إنا لم نجئ لقتال أحد ولكننا جئنا معتمر))(65)

"اللہ کی قسم! اگر آج قریش مجھ سے کوئی ایسا معاہدہ طلب کریں، جس میں صلہ رحمی ہو، تو میں اسے ضرور قبول کروں گا۔"(---)"ہم کسی سے جنگ کرنے نہیں آئے، بلکہ ہم عمرہ ادا کرنے کے لیے آئے ہیں۔"

قریش کی حکمت عملی: فوجی مزاحمت

آپ ﷺ کی حکمت عملی کے مقابلہ میں قریش نے سخت مزاحمت کی، اس خوف سے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں امن کے ساتھ داخل ہو گئے تو عرب پر ان کا سیاسی غلبہ کمزور ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو روکنے کے لیے ہر طرح کی کوشش کی۔

علامہ واقدی نے قریش کے اس موقف کو یوں بیان کیا ہے:

"وہ (محمد ﷺ) ہمیں اپنے لشکر کے ساتھ عمرہ کرنے کے بہانے مکہ میں داخل ہونا چاہتے ہیں، اور اگر ایسا ہو گیا تو عرب کے قبائل سنیں گے کہ وہ بغیر کسی مزاحمت کے مکہ میں داخل ہو گئے۔ ہم کسی بھی صورت میں ایسا نہیں ہونے دیں گے، جب تک ہماری آنکھوں میں بینائی باقی ہے"(66)

اس صلح کے ذریعے آپ ﷺ نے متعدد اہم اور کامیاب حکمت عملیاں اپنائیں جیسا کہ:

1. قریش کی طرف سے تنازعہ کو بڑھانے کی کوششوں کے باوجود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر اور حکمت کی پالیسی اپنائی۔ قریش نے اپنی فوجیں جمع کیں، اپنے اتحادیوں کو متحرک کیا، پانی کے ذرائع پر قبضہ کیا، جاسوس بھیجے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جو آپ ﷺ کی جانب سے ایلچی کے طور پر بھیجے گے تھے، قید کر لیا۔ انہوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) کو بھی مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔(67) تاہم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضبط نفس کا مظاہرہ کیا، دفاعی حکمت عملی اختیار کی، کفار کی نقل و حرکت معلوم کرنے کا مکمل انتظام کیا، مسلمانوں کے کیمپ کی حفاظت کے لیے محافظ مقرر کیے، اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی افواہ پھیل گئی تو بیعت رضوان کے ذریعے دشمن کے دلوں میں خوف پیدا کیا۔(68) کفار کے بعض لوگوں کو جو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے آئے تھے ان کو قید کر لیا گیا، تاہم بعد میں آپ ﷺ نے مسلمان قیدیوں کے بدلے انہیں رہا کر دیا۔
2. مذاکرات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شاندار سفارت کاری کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے مختلف ایلچیوں کی شخصیات کا جائزہ لیا اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا۔(69) الحلیس بن علقمہ، (احابیش کا سردار) جو اپنی جاہلیت کے باوجود روحانیت کا رجحان رکھتا تھا اور حاجیوں کی تعظیم کے ساتھ ساتھ قربانی کے جانوروں کی عزت بھی کرتا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ نے اسے دیکھا تو فرمایا: "یہ فلاں شخص ہے، جو قربانی کے جانوروں کی بڑی تعظیم کرتا ہے، اسے یہ جانور دکھاؤ۔" چنانچہ، اسے قربانی کے جانور دکھائے گئے اور مسلمانوں نے بلند آواز سے تلبیہ پڑھا۔ یہ منظر دیکھ کر الحُلیس نے کہا: "سبحان اللہ! ان لوگوں کو بیت اللہ سے روکا نہیں جانا چاہیے۔" اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جب یہ واپس گیا تو اس نے قریش مکہ سے کہا کہ اگر تم نے ان لوگوں کو آنے نہ دیا تو میں تم پر اپنے قبیلہ سمیت حملہ کر دوں گا۔(70)

مکرز ابن الخیف، جو خیانت کے لیے مشہور تھا، کو بہت کم توجہ دی گئی۔ تاہم جب سہیل بن عمرو جو کہ ایک ماہر مذاکرات کار تھا وہاں پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہچان لیا کہ قریش صلح کے لیے تیار ہیں۔(71) اس طرح آپ نے جنگ کے بجائے اسٹریٹجک ڈپلومیسی کے ذریعے پرامن حل کی راہ ہموار کی جو قریش کی جارحانہ پالیسیوں اور مثالی حکمت اور دور اندیشی کے بالکل برعکس تھی۔

3. سہیل بن عمرو کے ساتھ براہ راست مذاکرات کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اشتعال انگیزیوں کو نظر انداز کر دیا۔ سہیل نے معاہدے میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے جملے کو شامل کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی جگہ "باسمک اللھم" لکھنے پر اصرار کیا۔ سہیل نے "محمد الرسول اللہ" کے لقب کو بھی مسترد کر دیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ اس کے بجائے صرف "محمد ابن عبد اللہ" لکھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شرائط کو قبول کرتے ہوئے کہا: "خدا کی قسم، میں یقیناً اللہ کا رسول ہوں، خواہ تم اس کا انکار کرو۔"(72)
4. نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بات پر توجہ مرکوز کی جسے مذاکرات کے ماہرین مذاکرات کے طویل مدتی اثرات کہتے ہیں۔ آپ ﷺ کی ترجیحات میں مسلمانوں کی حفاظت، اپنے مشن کی حفاظت اور اپنی ریاست کو قریش سے تسلیم کرانا شامل تھا۔ اس کے برعکس قریش کے پاس ایک قلیل نظری کا نقطہ نظر تھا، جو صرف فوری فوائد پر مبنی ہوتا تھا، جیسے کہ قبائل میں ان کا وقار برقرار رکھنے کے لیے مسلمانوں کو اس سال عمرہ کرنے سے روکنا اور اس شرط کو نافذ کرنا کہ مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے والے کسی بھی نئے مذہب کو واپس لایا جائے۔(73)

مضبوط گفت وشنید کا ایک راز، جیسا کہ راجر ڈاسن زور دیتے ہیں، یہ ہے کہ "ایک طاقتور مذاکرات کار وہ ہوتا ہے جو دوسرے فریق کو یہ محسوس کرائے کہ وہ جیت گیا ہے، حالانکہ اس نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے جو وہ چاہتا تھا۔"(74) اپنی غیر معمولی گفت وشنید کی مہارت کے ذریعے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو اپنی مختصر مدت کی فتح سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا جب وہ حدیبیہ سے اپنے تزویراتی مقاصد حاصل کر کے واپس آئے۔ ان میں سے سب سے اہم بات قریش کو بے اثر کرنا تھا اور ان سے ابھرتی ہوئی اسلامی ریاست کی واضح شناخت حاصل کر لی تھی۔ اس کے نتیجے میں، اسلام کے پھیلاؤ کے دروازے کھل گئے۔ اور یہی اصل فتح تھی۔

میثاقِ مدینہ: نبی کریم ﷺ کی اختیار کردہ اہم حکمت عملیاں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے، مدینہ (سابقہ یثرب) ایک متنوع معاشرہ تھا جس میں مختلف مذہبی اور سماجی گروہوں کا امتزاج تھا۔ دو اہم عرب قبائل، اوس اور خزرج، جو بعد میں انصار کے نام سے مشہور ہوئے، چھوٹے یہودی قبیلوں یعنی بنو قریظہ، بنو نضیر، اور بنو قینقاع سمیت متعدد یہودی قبائل کے ساتھ مل کر رہے۔

تاریخی طور پر ان عرب اور یہودی قبائل کے درمیان تنازعات شروع ہوئے تھے جس کے نتیجے میں اوس اور خزرج کا یہودی قبائل پر غلبہ تھا۔ تاہم، اپنا اثر ورسوخ کھونے کے بعد، یہودی دھڑوں نے اوس اور خزرج کے درمیان اختلافات کو ہوا دینا شروع کیا، جس کے نتیجے میں تقریباً 150 سال تک طویل اندرونی جنگیں ہوئیں۔ ان میں سب سے زیادہ تباہ کن جنگ "یوم بعاث" تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے چند سال پہلے ہوئی تھی۔(75)

جیسا کہ مارٹن لنگس نے بھی نوٹ کیا، اس مسلسل دشمنی اور بڑھتے ہوئے تشدد نے دونوں اطراف کے بہت سے اعتدال پسند رہنماؤں کو اس بات پر قائل کیا کہ کسی ایسے قائد کا ہونا ضروری ہے جو مدینہ میں استحکام لا سکے، جیسا کہ قصی ابن کلاب نے ایک بار قریش کو متحد کیا تھا۔ اس احساس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثالثی کی ایک اہم حکمت عملی کو نافذ کرنے کی راہ ہموار کی، جس کے نتیجے میں میثاقِ مدینہ قیام عمل میں آیا، جس نے مختلف دھڑوں کو ایک سیاسی اور سماجی فریم ورک کے تحت متحد کیا۔(76)

مدینہ کے سیاسی حالات اور میثاقِ مدینہ کی تشکیل:

مدینہ میں، عبد اللہ ابن ابی کو ابتدائی طور پر شہر کے حکمران کے طور پر تجویز کیا گیا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت نے صورتحال کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ مقامی قبائل نے ان کی طرف توجہ دلائی، اور آپ ﷺ نے شہر میں استحکام لانے کے لیے ایک مضبوط سماجی اور سیاسی نظام قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔(77)

یلدرم کے مطابق، مدینہ کے قبائل نے درج ذیل وجوہات کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کو قبول کیا:

1. قیادت کا خلا تھا۔
2. عرب ثالثی کے عادی تھے۔
3. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر جانبدار اور قابل اعتماد شخصیت تھے۔
4. آپ ﷺ کو "صادق وامین" کے لقب سے جانا جاتا تھا، جس نے آپ ﷺ کی قیادت کو مزید مضبوط کیا۔(78)

ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائلی رہنماؤں سے مشاورت کے ذریعے مدینہ منورہ کا چارٹر وضع کیا جو تین اہم حصوں پر مشتمل تھا:

1. مسلمانوں کے حقوق اور ذمہ داریاں
2. یہودی قبائل کے معاہدے اور ذمہ داریاں
3. مدینہ کے عمومی معاملات سے متعلق احکامات(79)

یہ اسلام میں تنازعات کے حل کی پہلی دستاویزی مثال تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تنازعات کو چھوٹے مسائل میں تقسیم کر کے جدید حکمت عملیوں کی طرح ثالثی کی تکنیک کا استعمال کیا، جسے (Conflict Fragmentation) کہا جاتا ہے۔ پس آپ ﷺ نے اس حکمت عملی کے ذریعے دو اہم فوائد حاصل کیے:

1. پیچیدہ تنازعات کو حل کرنا آسان بنا دیا۔
2. تناؤ کو کم کیا اور متحارب دھڑوں کے درمیان مفاہمت کو آسان بنایا۔

اس حکمت عملی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر جانبدارانہ، منصفانہ اور دور اندیش قیادت کا اظہار ہوا، جس نے بالآخر مدینہ کو ایک متحد اور مستحکم ریاست میں تبدیل کر دیا۔(80)

میثاق مدینہ میں تنازعات کے حل کا طریقہ کار:

Fisher کے مطابق متعلقہ فریقوں کی شناخت اور براہ راست مادی مسائل تنازعات کو تقسیم کرنے کے لیے بنیادی جہتیں ہیں۔(81) میثاق مدینہ کو 47 دفعات میں تشکیل دیا گیا، جو اس تنازع میں شامل مفادات اور طاقت کے ڈھانچوں سے ہم آہنگ تھیں۔

یثرب کے تنازعے کے اہم اسٹیک ہولڈرز کو آرٹیکل 4-11 اور 25-35 میں بیان کیا گیا ہے۔ متنوع آبادی کے گروہوں کو واضح طور پر بیان کرتے ہوئے اور مشترکہ مفادات کی بنیاد پر تنازعات کو حل کرتے ہوئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مذہبی پس منظر کے لوگوں کے درمیان مفاہمت کی سہولت فراہم کی۔ آپ ﷺ کی اس حکمت عملی کا مقصد انہیں مشترکہ مفادات کو تسلیم کرنے کی ترغیب دینا اور یہ واضح کرنا تھا کہ ان کے مفادات قبائلی اور مذہبی تقسیم سے بالاتر ہونے چاہیں، اس طرح قبائلی مذہبی تنازعات کی شدت کو کم کر دیا گیا۔(82)

چارٹر نے سماجی انصاف اور سلامتی کے اصول بھی متعارف کروائے، جیسے:

1. افراد سے انصاف حاصل کرنے کے حق کو مرکزی اتھارٹی کو منتقل کرنا۔
2. قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کسی بھی شخص کی حمایت پر پابندی لگانا (دفعات 19، 21، 22، 40)۔

یہ دفعات اجتماعی اتحاد اور قانونی نظم و نسق کو تقویت دینے میں معاون ثابت ہوئیں۔ بالآخر مدینہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ایک مستحکم اور منظم معاشرے کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔

مشترکہ اہداف کی ترقی

William Ury کے مطابق، تنازعات کے حل کے لیے ایک مؤثر نقطہ نظر طاقت کے بجائے مفادات پر توجہ مرکوز کرنا ہے، کیونکہ طاقت اکثر تنازعات کو بڑھاتی ہے، جب کہ مشترکہ مفادات انھیں حل کرنے میں مدد کرتے ہیں۔(83)

مدینہ کے چارٹر نے تمام باشندوں کے درمیان تعاون کے کئی اصول قائم کیے ہیں۔ مثال کے طور پر، آرٹیکل 13 کہتا ہے:

"مومنوں کو چاہیے کہ وہ ہر اس شخص کے خلاف متحد ہو جائیں جو ظلم، گناہ، جارحیت یا فساد کا خواہاں ہو، چاہے وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔"

اسی طرح آرٹیکل 37 اور 38 میں واضح کیا گیا ہے کہ یثرب پر بیرونی حملے کی صورت میں تمام فریقین اس کے دفاع کے لیے اجتماعی طور پر ذمہ دار ہوں گے اور اس دفاع کے اخراجات مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان مشترکہ ہوں گے۔

یہ انتظامات اجتماعی ذمہ داری کے تصور کو فروغ دیتے ہیں، تمام شہریوں کو قبائلی اتحاد سے بالاتر ہو کر مشترکہ امن اور استحکام کے لیے کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، اس طرح تنازعات کے حل میں مدد ملتی ہے۔

اتھارٹی کے تصورات کو تبدیل کرنے کا طریقہ

یثرب کے باشندے حریف قبائل میں بٹے ہوئے تھے، ہر ایک آزادانہ طور پر کام کر رہا تھا، جس کی وجہ سے ایک معاشرہ اکثر تناؤ سے دوچار تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم اور تفویض کے ذریعے اقتدار کی ان کشمکشوں کا ازالہ کیا۔ میثاقِ مدینہ نے واضح طور پر ایک اعلیٰ اختیار قائم کیا جس کی جانب مستقبل کے تنازعات کے حل کے لیے رجوع کیا جائے گا، جیسا کہ آرٹیکل 23 میں کہا گیا ہے: "تم لوگ جس چیز میں بھی اختلاف کرو گے، اس کے حل کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی جانب رجوع کیا جائے گا۔" آرٹیکل 42 میں اس اصول کی توثیق کی گئی۔ اس میثاق میں نے فریقین کے درمیان تنازعات کی بھی ممانعت کی گئی ہے، جیسا کہ آرٹیکل 15 اور 17 میں بیان کیا گیا ہے، اور باہمی مشاورت اور مخلصانہ مشورے کے فرض پر زور دیا گیا ہے، جیسا کہ آرٹیکل 37 میں کہا گیا ہے: "ان کے درمیان باہمی مشاورت اور اخلاص ہونا چاہیے، بغیر کسی غلط کام کے۔" مزید بر آں، آرٹیکل 44 فریقین کو پابند کرتا ہے کہ وہ یثرب پر کسی بھی حملے کے خلاف ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔

اگرچہ میثاقِ مدینہ نے قبائلی ڈھانچے کو تبدیل نہیں کیا، لیکن اس نے شناخت کا ذریعہ مذہب کو منتقل کر دیا۔ جو متعدد شقوں میں واضح ہے، جیسے کہ دفعہ 44: "کسی بھی مومن کے لیے یہ حلال نہیں ہے جس نے اس دستاویز کو قبول کیا ہو اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو..."۔ مزید بر آں، اس نے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تعاون کو فروغ دیا، جیسا کہ دفعہ 46 میں بیان کیا گیا ہے۔ اس نقطہ نظر نے مختلف دھڑوں کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنے وقار کو برقرار رکھتے ہوئے قبائلی دشمنیوں کو ترک کر سکیں، اور انہیں روایتی اتحاد سے باہر دیکھنے کی اجازت دی۔ تنازعات کی تقسیم، تعاون پر مبنی مقاصد کی ترقی، اور طاقت کے ادراک کی تبدیلی کے ذریعے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تنازعات کو حکمت عملی اور پائیدار طریقے سے کامیابی کے ساتھ حل کیا۔

نتائج:

اس تحقیق میں اقوام متحدہ کے چارٹر کے درج ذیل مضامین کا سیرت رسول ﷺ کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے۔

1. آرٹیکل 2 (شق 4,3,2,1) (ریاستی خود مختاری، مساوات، تنازعات کا پرامن حل، اور طاقت کی ممانعت)
2. آرٹیکل 33 (شق 1) (پرامن تنازعات کے حل کے لیے سفارتی اور قانونی ذرائع)
3. آرٹیکل 43 (شق 3,2,1) (رکن ممالک کی اجتماعی سلامتی کی ذمہ داریاں)

اسی طرح اسلامی تعلیمات بالخصوص میثاق مدینہ، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ میں اختیار کی جانے والی وہ تمام حکمت عملیاں جو عالم دنیا میں امن اور انصاف کا بول بولا یقینی بنانے کے لیے اختیار کی گئی ہیں، ان کو سامنے رکھ کر درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

1. ریاستی خود مختاری اور مساوات (اقوام متحدہ کے چارٹر آرٹیکل 2، شق 1، 2)

اسلامی نقطہ نظر:

- اسلامی تعلیمات میں امن کا تصور عدل، مساوات، اور اجتماعی فلاح پر مبنی ہے، جو وحی الٰہی، رسول اللہ ﷺ کی سیرت، اور خلافتِ راشدہ

کے تجربات سے ماخوذ ہے۔

- قرآن (المائدہ:8) مخالفوں کے خلاف بھی انصاف کا حکم دیتا ہے۔
- مدینہ کے چارٹر نے اجتماعی استحکام کو ترجیح دیتے ہوئے تمام گروہوں (مسلمانوں، یہودیوں اور دیگر قبائل) کو مساوی حقوق اور خود مختاری دی ہے۔
- میثاقِ مدینہ اسلامی اصولوں پر مبنی بین الاقوامی امن کی پہلی عملی مثال ہے، جہاں مختلف گروہوں کے درمیان معاشرتی معاہدہ، عدل، اور دفاعی اشتراک کو بنیاد بنایا گیا۔

مغربی نقطہ نظر:

- اقوام متحدہ کا چارٹر ریاست کی خود مختاری کو تسلیم کرتا ہے، لیکن عملی طور پر طاقتور اقوام کمزور ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کرتی ہیں، جس سے یہ اصول کمزور ہوتا ہے۔
- مغربی دنیا میں امن کا دارومدار سیکولر جمہوریت، انسانی حقوق، اور عالمی اداروں (مثلاً اقوام متحدہ) کی قراردادوں پر ہوتا ہے، جہاں طاقت اور سیاسی مفادات اکثر غالب آجاتے ہیں۔
- بڑی طاقتیں خود مختاری کا احترام صرف اس وقت کرتی ہیں جب وہ ان کے قومی مفادات (جیسے عراق، افغانستان) کے مطابق ہو۔

پس اسلامی نقطہ نظر زیادہ جامع ہے، کیونکہ یہ خود مختاری کا احترام کرتا ہے اور اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ انصاف اور اجتماعی بہبود کو ترجیح دی جائے۔ اس کے برعکس، اقوام متحدہ کا ماڈل طاقت کے توازن پر زیادہ انحصار کرتا ہے۔

2. پر امن تنازعات کا حل (اقوام متحدہ کا چارٹر آرٹیکل 2، شق 3؛ آرٹیکل 33، شق 1)

اسلامی نقطہ نظر:

- اسلام تنازعات کے حل کے لیے سفارت کاری، ثالثی اور مشاورت کی پرزور حمایت کرتا ہے۔
- ثالثی اور مشاورت: نبی کریم ﷺ نے بطور غیر جانبدار ثالث یثرب کے متحارب گروہوں کو ایک مشترکہ معاہدے پر متفق کیا، جو آج کے سفارتی اصولوں سے زیادہ جامع اور موثر تھا۔
- مشترکہ دفاع: میثاقِ مدینہ میں تمام فریقین پر مشترکہ دفاعی ذمہ داری عائد کی گئی، جس سے قبائلی وفاداریوں کو اجتماعی امن کے تابع کر دیا گیا۔
- تنازع کی تجزیہ کاری: رسول اللہ ﷺ نے امن قائم کرنے کے لیے تنازعات کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا، تاکہ ہر فریق کو اس کے بنیادی مفادات کی بنیاد پر امن کا قائل کیا جاسکے۔
- قرآن (الحجرات:9) مومنوں کو متحارب گروہوں کے درمیان ثالثی کرنے اور جارحین کے خلاف انصاف نافذ کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

مغربی نقطہ نظر:

- اقوام متحدہ کا چارٹر مذاکرات، ثالثی اور سفارت کاری کو فروغ دیتا ہے، لیکن عملی طور پر، طاقتور ممالک اکثر فوجی طاقت کا سہارا لیتے ہیں (جیسے، شام، لیبیا، فلسطین)۔
- تنازعات کے حل میں دوہرے معیارات ہیں، جہاں کچھ ممالک کو سخت پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ دیگر کو چھوٹ دی جاتی ہے۔

لہٰذا اسلامی ماڈل زیادہ متوازن ہے کیونکہ یہ حقیقی انصاف اور غیر جانبدارانہ ثالثی کو یقینی بناتا ہے، جبکہ اقوام متحدہ کے ماڈل کو اکثر بااثر ریاستیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

3. طاقت کی ممانعت اور اجتماعی سلامتی کو یقینی بنانا (اقوام متحدہ کا چارٹر آرٹیکل 2، شق 4؛ آرٹیکل 43، شق 1،2،3)

اسلامی نقطہ نظر:

- اسلام جنگ اور طاقت کے استعمال کو آخری حربے کے طور پر دیکھتا ہے، جو صرف اپنے دفاع اور ظلم کے خاتمے کے لیے جائز ہے (البقرہ: 190-191)۔
- مدینہ کے چارٹر نے تمام گروہوں پر اجتماعی دفاع کی ذمہ داریاں عائد کی ہیں تاکہ کسی ایک گروہ کے ظلم کو روکا جا سکے۔
- اسلام میں طاقت کے استعمال کو سختی سے کنٹرول کیا گیا ہے اور اس کی اجازت صرف انصاف کو برقرار رکھنے کے لیے ہے، جارحیت یا توسیع کے لیے نہیں۔

مغربی نقطہ نظر:

- اقوام متحدہ کا چارٹر طاقت کے استعمال کی ممانعت کرتا ہے لیکن طاقتور ریاستیں اکثر اس اصول کی خلاف ورزی کرتی ہیں۔
- اقوام متحدہ کی امن فوج عالمی سلامتی کے لیے بنائی گئی تھی، لیکن یہ اکثر غیر جانبدار امن قائم کرنے کے بجائے بڑی طاقتوں کے مفادات کے لیے کام کرتی ہے۔ عراق، افغانستان اور لیبیا میں یکطرفہ فوجی مداخلت اس اصول کی خلاف ورزی کی مثالیں ہیں۔

لہٰذا اسلامی تصورِ امن میں طاقت کے استعمال کو انتہائی محدود اور اخلاقی اصولوں کے تابع رکھا گیا ہے، جب کہ مغربی ماڈل میں طاقت کا استعمال اکثر ریاستی مفادات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

سفارشات:

- ❖ انصاف پر مبنی تنازعات کے حل کا نظام: جہاں ثالثی اور مفاہمت کے عمل غیر جانبدار ہوں اور عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی ہوں، تاکہ عالمی سطح پر امن و امان کو طاقت کے بجائے، انصاف کی بنا پر قائم کیا جا سکے
- ❖ اقوام متحدہ کے اجتماعی سلامتی کے نظام میں اصلاحات: بشمول ویٹو پاور کا خاتمہ، غیر مجاز فوجی مداخلتوں کے خلاف سخت اقدامات، اور جنگ کے اسلامی اخلاقی اصولوں کو شامل کرنا۔
- ❖ قیام امن کی اجتماعی ذمہ داری کو فروغ دینا: جس میں نہ صرف ریاستیں بلکہ کمیونٹیز، مذہبی اور ثقافتی اداروں اور عالمی امن کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے میں علاقائی اتحاد بھی شامل ہوں۔

حوالہ جات

(1) Babbitt, E., & Hampson, O. (2011). "Conflict Resolution as a Field of Inquiry: Practice Informing Theory," International Studies Review 13(1), pp. 46–57.

(2) Scott R. Appleby ایک مشہور امریکی مورخ اور بین الاقوامی تعلقات کے ماہر ہیں، جنہیں مذہب، تشدد اور امن کے درمیان تعلق پر اپنی مایہ ناز تحقیق کے لیے بڑے پیمانے پر جانا جاتا ہے۔ وہ نئی دنیا کے عالمی امور (Keough School of Global Affairs) کے ڈین اور نوٹر دام یونیورسٹی (University of Notre Dame) میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔

اپنی مشہور کتاب، "The Ambivalence of the Sacred: Religion, Violence, and Reconciliation" (2000) میں، وہ دلیل دیتے ہیں کہ مذہب بعض اوقات انتہاپسندی کو فروغ دیتا ہے، لیکن یہ امن کو فروغ دینے اور تنازعات کو حل کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

Appleby نے مختلف عالمی فورمز پر مذہبی تنازعات اور امن کی کوششوں میں مذہبی رہنماؤں کے کردار پر وسیع تحقیق کی ہے۔ وہ مذہبی بنیاد پرستی کا تجزیہ کرنے والے ایک مشہور تحقیقی اقدام "بنیاد پرستی پراجیکٹ" کے شریک ایڈیٹر بھی تھے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں:

Appleby, Scott R. 2000. The Ambivalence of the Sacred: Religion, Violence, and Reconciliation. Lanham, MD: Rowman & Littlefield.

(3) الطبطبائی، محمد عبد الرزاق، (1993)۔ حل المنازعات بالوسائل السلمیہ بین الدول الإسلامیہ في الفقہ الإسلامي والقانون الدولی۔ رسالہ ماجستر، المعہد العالی للقضاء، جامعہ الإمام محمد بن سعود الإسلامیہ۔

(4) جبریل، محمد یوسف، (2001)۔ فض النزاعات الدولیہ بالطرق السلمیہ في الشریعہ الإسلامیہ والقانون الوضعی، رسالہ ماجستر، کلیہ الدراسات العلیا، جامعہ أم درمان الإسلامیہ۔

(5) ابو النمر، محمد، (2008)۔ اللاعنف وصنع السلام في الإسلام، ترجمہ: لمیس الیحیی، (ط 1)، عمان: الدار الأہلیہ للنشر۔

(6) غزالی، محمد بن محمد. احیاء علوم الدین. کراچی: دار الاشاعت، 1993، جلد 1، صفحہ 50۔

(7) ابن خلدون، عبد الرحمن بن محمد. المقدمۃ. بیروت: دار الفکر، 1981، ج 1، ص 353۔

(8) Hobbes, Thomas. Leviathan. London: Andrew Crooke, 1651, Part I, Chapter XIII, Page 62

(9) Locke, John. Two Treatises of Government. London: Awnsham Churchill, 1689, Book II, Chapter II, Section 6

(10) Kant, Immanuel. Perpetual Peace: A Philosophical Sketch. Königsberg: Friedrich Nicolovius, 1795, Pages 99-104

(11) Burton, John. Conflict Resolution and Provention. New York: St. Martin's Press, 1990, p. 45.

(12) Fisher, Roger, and William Ury. Getting to Yes: Negotiating Agreement Without Giving In. Boston: Houghton Mifflin, 1981, p. 12.

(13) Thucydides. History of the Peloponnesian War. Translated by Richard Crawley, London: J.M. Dent, 1910.

(14) Hobbes, Thomas. Leviathan. London: Andrew Crooke, 1651.

(15) Locke, John. Two Treatises of Government. London: Awnsham Churchill, 1689.

(16) Rousseau, Jean-Jacques. The Social Contract. Translated by G.D.H. Cole, London: J.M. Dent, 1913

(17) Kant, Immanuel. Perpetual Peace: A Philosophical Sketch. Translated by Mary Campbell Smith, London: George Allen & Unwin, 1903

(18) Salem, P. (1993). "In Theory: A Critique of Western Conflict Resolution from a Non- Western Perspective", Negotiation Journal, 9(4), pp. 361-369.

(19) 1648ء میں منعقد ہونے والے ویسٹ فیلیا کا معاہدہ، جس نے یورپی ریاستوں کے درمیان مذہبی جنگوں کا خاتمہ کیا، کلیسا کی سیاسی طاقت کو ختم کیا، اور ایک نیا بین الاقوامی نظام قائم کیا جس کی بنیاد مطلق ریاستی خودمختاری اور عدم مداخلت کے اصولوں پر تھی۔

(20) Richmond, O. (2001). Maintaining Order, Making Peace. New York: Palgrave, p. 2.

(21) النحل:16:90

(22) القرطبي، محمد بن أحمد، الجامع لأحكام القرآن، ط2، القاهرة: دار الكتب المصرية، ج6، ص110

(23) الاصفهانی، الراغب، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، ط1، دمشق، دار الشامیۃ، ص236۔

(24) الطرطوشی، محمد بن محمد، سراج الملوک، ط1. القاهرة: الدر المصرية اللبنانية، ص218۔

(25) المائدۃ:5:8

(26) الزمخشری، محمود بن عمرو، الکشاف، ط3. بیروت: دار الکتاب العربی، ج1، ص612.

(27) Salem, "A Critique of Western Conflict Resolution", a previous reference, pp. 361-369.

(28) فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے کس قسم کی حکمت عملی اختیار کی، اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: بخاری، الجامع الصحیح، کتاب المغازی، بَابُ أَيْنَ رَكَزَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّايَةَ يَوْمَ الْفَتْحِ، حدیث:4280؛ مسلم، صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب فتح مکۃ، حدیث:4622؛ سنن ابوداؤد، کتاب الخراج والامارۃ، باب ماجاء فی خبر مکۃ، حدیث:3022۔

(29) کسی شے کا بیک وقت اپنی نقیض سے اس طرح متصف ہونا کہ وہ حق اور باطل دونوں ہو، ممکن نہیں ہے۔ یہ فلسفہ ارسطوئی منطق (Aristotelian Logic) سے مطابقت رکھتا ہے، جسے مغربی تہذیب نے ایک دور میں اپنایا تھا لیکن بعد میں جدیدیت کے اثرات کے تحت ترک کر دیا۔ ملاحظہ کریں: ضاهر، جمال، مدخل إلى علم المنطق: أساسيات وتطبيقات، (ط1)، بيروت، دار الفارابي، ص14۔

(30) مسلم، صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب صلح الحدیبیۃ فی الحدیبیۃ، حدیث:4632۔

(31) Wallensteen, P. (2015). Understanding Conflict Resolution, London: SAGE, p. 16.

(32) السباعي، محمد، نظام السلم والحرب في الإسلام، ط2، الرياض: دار الوراق، ص3۔

(33) سیموئیل ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order (1996) میں تجویز پیش کی کہ مستقبل کے عالمی تنازعات بنیادی طور پر سیاسی یا معاشی مفادات کے بجائے تہذیبی اور ثقافتی شناختوں سے چلیں گے۔ ان کے مطابق دنیا الگ الگ تہذیبوں میں بٹی ہوئی ہے جن میں مغربی، اسلامی، چینی، ہندو، آرتھوڈوکس، لاطینی امریکی اور افریقی شامل ہیں اور مستقبل میں ان تہذیبی خطوط پر تنازعات جنم لیں گے۔ اس نے خاص طور پر مغرب اور اسلام کے درمیان ایک بڑے تصادم کی پیشین گوئی کی اور اسے تاریخ کے قدیم ترین اور پائیدار تنازعات میں سے ایک قرار دیا۔ اس کے نظریہ نے مغربی پالیسی سازوں کو خاصا متاثر کیا، لیکن ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ غیر ضروری طور پر عالمی سیاست کو تہذیبی خطوط پر تقسیم کرتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

Huntington, Samuel P. (1996)The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order. New York: Simon & Schuster, pp. 68-71.

(34) البقرۃ:2:251

(35) صلح حدیبیہ (6 ہجری) اس بات کی نمایاں مثال ہے کہ اسلام طاقت کے بجائے پہلے پرامن ذرائع کو ترجیح دیتا ہے۔ جب قریش نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا، تو نبی کریم ﷺ نے بجائے جنگ کے، ایک معاہدہ کیا، حالانکہ مسلمانوں کے پاس عسکری طاقت موجود تھی۔ بظاہر یہ معاہدہ مسلمانوں کے حق میں کمزور دکھائی دیتا تھا، لیکن اس نے بعد میں فتح مکہ کی راہ ہموار کی، جو بغیر کسی خونریزی کے مکمل ہوئی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی قیادت طاقت کے استعمال سے پہلے ہمیشہ صلح اور مذاکرات کو موقع دیتی تھی، اور جنگ کو صرف ناگزیر حالات میں اختیار کیا جاتا تھا۔

(36) مغربی نظریہ: Just War Theory مغرب میں جنگ کے جواز اور اصولوں پر مبنی ایک اخلاقی و فلسفیانہ نظریہ ہے، جو سینٹ آگسٹین (St. Augustine) اور سینٹ تھامس ایکویناس (St. Thomas Aquinas) جیسے مفکرین نے پیش کیا۔ اس نظریے کے مطابق، جنگ کو بعض مخصوص حالات میں جائز قرار دیا جاتا ہے، جیسے خود دفاع، ظلم کے خلاف مزاحمت، یا بین الاقوامی استحکام کے لیے۔ ملاحظہ کریں:

Augustine, The City of God, trans. Henry Bettenson (London: Penguin Books, 2003), Book XIX, Chapter 7.

Aquinas, Thomas. Summa Theologica, trans. Fathers of the English Dominican Province (New York: Benziger Bros., 1947), Part II-II, Question 40, Article 1.

ایک عملی مثال جارج بش (George W. Bush) کی عراق جنگ (2003) ہے، جسے امریکی قیادت نے "Just War" کے اصولوں کے تحت جواز فراہم کیا۔ امریکی حکومت نے دعویٰ کیا کہ عراق کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار (Weapons of Mass Destruction) ہیں، اور اس کے خلاف جنگ ایک "جائز" اقدام ہے تاکہ عالمی امن قائم رکھا جاسکے۔ تاہم، بعد میں یہ ثابت ہوا کہ یہ دلیل بے بنیاد تھی، اور اس جنگ نے مزید تنازعات کو جنم دیا۔
Johnson, James Turner. Just War Tradition and the Restraint of War: A Moral and Historical Inquiry. Princeton University Press, 1981

(37) اقوام متحدہ کے چارٹر میں بیان ہونے والے ان آرٹیکلز کی تفصیلات جاننے کے لیے ملاحظہ کریں:
United Nations. Charter of the United Nations. San Francisco, 24 October 1945. P: 3 , 8 , 9

(38) Osmańczyk, E. (2003). Encyclopedia of the United Nations and International Agreements: G to M, London: Taylor & Francis, p. 1375.
(39) UN Office of Legal Affairs, (1992). Handbook on the Peaceful Settlement of Disputes between States, New York: United Nations Publications, p. 9.

(40) Zartman, W. (1973). "Negotiation: Theory and Reality", Journal of International Affairs, 29(1), pp. 69-77.
(41) Przetacznik, F. (1983). Protection of Officials of Foreign States According to International Law, London: BRILL, p. 253.

(42) الزحيلي، وهبة. المفاوضات في الإسلام، مجلة كلية الدراسات الاسلامية والعربية، الإمارات، ع(7)، ص 31-55

(43) الانفال: 8:61

(44) فلسطینی عوام کے لیے اقوام متحدہ نے جو ناقابلِ تنسیخ قومی حقوق تسلیم کیے ہیں، ان کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ کریں:
https://www.un.org/unispal/wp-content/uploads/2016/05/ARES3236XXIX.pdf

(45) صلح حدیبیہ کی شرائط اور دیگر تفصیلات کے لیے ملاحظہ کریں: ابن الاثیر، محمد بن محمد، الکامل فی التاریخ، دار الکتاب العربی، بیروت، 1997ء، ج2، ص85۔

(46) ابن سعد، طبقات الکبریٰ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1990، ج2، ص20۔

(47) السرخسي، محمد بن أحمد، شرح السير الكبير، ط1، بيروت: دار الكتب العلمية، ج2، ص37-42

(48) ابو داؤد، سنن ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب فی صلح العدو، حدیث: 2765۔

(49) Zartman, W. (2001) The Timing of Peace Initiatives: Hurting Stalemates and Ripe Moments, Global Review of Ethno-politics, 1(1), pp. 8–18.
(50) Osmańczyk, Encyclopedia of the United Nations: T to Z, a previous reference, p. 854.
(51) Herrberg, A. (2012). International Peace Mediation, Geneva: Geneva Centre for the Democratic Control of Armed Forces, p. 9.

(52) الحجرات، 49:9

(53) النساء، 4:114

(54) بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الصلح، باب ماجاء فی الاصلاح بین الناس، حدیث: 2690۔

(55) ترمذی، سنن ترمذی، کتاب الاحکام، باب ماذکر عن رسول اللہ ﷺ فی الصلح بین الناس، حدیث: 1352۔

(56) بخاری، الجامع الصحیح، کتاب المغازی، حدیث: 4024۔

(57) ابن کثیر، إسماعیل بن عمر، السیرة النبویة، بیروت: دار المعرفة، ج2، ص359۔

(58) ایضا، ج3، ص375۔

(59) بخاری، الجامع الصحیح، کتاب تفسیر القرآن، باب: {إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ}، حدیث: 4844۔

(60) الشوریٰ: 42:38

(61) مکمل حدیث کے لیے ملاحظہ کریں: مسلم، صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب النہی عن الشفاعۃ فی الحدود، حدیث:4410۔

(62) Irani, G. (1998). Rituals of Reconciliation, Arab Studies Quarterly, 20(4), pp. 53-73.

(63) بخاری، الجامع الصحیح، کتاب تفسیر القرآن، بَابُ: {إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ}، حدیث:4844؛ مسلم، صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب صلح الحدیبیۃ، حدیث:4631۔

(64) البيلي، أمل بكري. الدبلوماسية الوقائية لدولة المدينة، رسالة ماجستير غير منشورة، كلية الدراسات العليا، جامعة أم درمان الإسلامية، ص 370۔

(65) ابن حنبل، مسند احمد، تحقیق: شعیب الأرناؤوط، ط1، بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، مسند الکوفیین، حَدِيثُ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ، ج21، ح18910. قال الأرناؤوط: إسناده صحیح۔

(66) الواقدی، محمد بن عمر، المغازی، ط3. بیروت: دار الأعلمي، ج2، ص579۔

(67) ایضا۔

(68) ابن كثير، السيرة النبوية، ج 3، ص 318۔

(69) دور حاضر میں اس کو "غیر زبانی اشارے" کے سمجھنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

Nierenberg, G. (2008). The New Art of Negotiating, New York: Square One Pub, p. 167.

(70) بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحة، حدیث:2731؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفی البابي الحلبي، 1955ء، ج2، ص312۔

(71) ایضا۔

(72) ایضا۔

(73) واقدی، المغازی، ج2، ص57

(74) داوسون، روجر، أسرار قوة التفاوض، ط 1، رياض، مكتبة جرير، ص 3۔

(75) السمهودي، علي بن عبد الله، وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفى، ط 1 بيروت: دار الكتب العلمية، ج 1، ص 170؛ اليعقوبي، أحمد بن جعفر، تاريخ اليعقوبي، ط1، بيروت، دار صادر، ج١، ص257۔

(76) Lings, M. (1983) Muhammad: his life based on the earliest sources. New York: Inner Traditions International, p.108.

(77) العلي، صالح، تنظيمات الرسول الإدارية في المدينة، مجلة المجمع العلمي العراقي، 17(127)، ص50–69.

(78) Yildirim, Y. (2009). The Medina Charter: A Historical Case of Conflict Resolution, Islam and Christian–Muslim Relations Journal, 20(4), pp. 439-450.

(79) حميد الله، محمد، مجموعة الوثائق السياسية للعهد النبوي والخلافةالراشدة، ط 6. بيروت: دار النفائس، ص59–62

(80) Deutsch, M., Coleman, P. Marcus, E. (2011). The Handbook of Conflict Resolution: Theory and Practice, New Jersey: John Wiley & Sons, p. 422.

(81) Fisher, R. (1971). "Fractioning Conflict," in Smith, G. (Ed.), Conflict Resolution: Contributions of the Behavioral Sciences, New York: Aldine Atherton, pp. 135–50.

(82) Yildirim, Y. (2009). The Medina Charter, a previous reference, pp. 439-450.

(83) Ury, W. (1988). Getting Disputes Resolved, San Francisco: Jossey-Bass, p. 9.